

الأحقاف

نام

آیت ۲۱ کے فقرے اذ اندر قومہ بالأحقاف سے ماخوذ ہے۔

زمانہ نزول

ایک تاریخی واقعہ سے جس کا ذکر آیات ۲۹-۳۲ میں آیا ہے۔ یہ سورہ ۱۰ نبوی کے آخر یا ۱۱ نبوی کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی۔

تاریخی پس منظر

۱۰ نبوی حضور کی حیات طیبہ میں انتہائی سختی کا سال تھا۔ تین برس سے قریش کے تمام قبیلوں نے مل کر بنی ہاشم اور مسلمانوں کا مکمل مقاطعہ کر رکھا تھا اور حضور اپنے خاندان اور اپنے اصحاب کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور تھے۔ قریش کے لوگوں نے ہر طرف سے اس محلے کی ناکہ بندی کر رکھی تھی جس سے گزر کر کسی قسم کی رسد اندر نہ پہنچ سکتی تھی۔ متواتر تین سال کے اس مقاطعہ نے مسلمانوں اور بنی ہاشم کی کمزور کر رکھ دی تھی اور ان پر ایسے ایسے سخت وقت گزر گئے تھے جن میں بسا اوقات گھاس اور پتے کھانے کی نوبت آ جاتی تھی۔

خدا خدا کر کے یہ محاصرہ اس سال ٹوٹا ہی تھا کہ حضور کے چچا ابوطالب، جو دس سال سے آپ کے لیے ڈھال بنے ہوئے تھے، وفات پا گئے، اور اس سانحے پر بمشکل ایک مہینہ گزارا تھا کہ آپ کی رفیقہ حیات حضرت خدیجہ بھی انتقال فرما گئیں جن کی ذات آغاز نبوت سے لے کر اس وقت تک آپ کے لیے وجہ سکون و تسلی بنی رہی تھی۔ ان پے در پے صدموں اور تکلیفوں کی وجہ سے حضور اس سال کو عام الحزن (رنج و غم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

حضرت خدیجہ اور ابوطالب کی وفات کے بعد کفار مکہ نبی ﷺ کے مقابلے میں اور زیادہ دلیر ہو گئے۔ پہلے سے زیادہ آپ کو تنگ کرنے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کا گھر سے باہر نکلنا بھی مشکل ہو گیا۔

آخر کار آپ اس ارادے سے طائف تشریف لے گئے کہ بنی ثقیف کو اسلام کی طرف دعوت دیں اور اگر وہ اسلام نہ قبول کریں تو انہیں کم از کم اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ آپ کو اپنے ہاں چھین سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع دے دیں۔ مگر {وہاں کے بڑے لوگوں} نے نہ صرف یہ کہ آپ کی کوئی بات نہ مانی، بلکہ آپ کو نوٹس دے دیا کہ ان کے شہر

سے نکل جائیں، مجبوراً آپ کو طائف چھوڑ دینا پڑا۔ جب آپ وہاں سے نکلنے لگے تو ثقیف کے سرداروں نے اپنے ہاں کے لفظوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ راستے کے دونوں طرف دور تک آپ پر آوازے کتے، گالیاں دیتے اور پتھر مارتے چلے گئے یہاں تک کہ آپ زخموں سے چور ہو گئے اور آپ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ اس حالت میں آپ طائف کے باہر ایک باغ کی دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے اور اپنے رب سے {دعا میں مشغول ہو گئے}۔ دل شکستہ و غمگین پلٹ کر جب آپ قرن المنازل کے قریب پہنچے تو محسوس ہوا کہ آسمان پر ایک بادل سا چھایا ہوا ہے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو جبریل علیہ السلام سامنے تھے۔ انہوں نے پکار کر کہا ”آپ کی قوم نے جو کچھ آپ کو جواب دیا ہے اللہ نے اسے سن لیا، اب یہ پہاڑوں کا منتظم فرشتہ اللہ نے بھیجا ہے، آپ جو حکم دینا چاہیں اسے دے سکتے ہیں۔“ پھر پہاڑوں کے فرشتے نے آپ کو سلام کر کے عرض کیا ”آپ فرمائیں تو دونوں طرف کے پہاڑ ان لوگوں پر الٹ دوں۔“ آپ نے جواب دیا، ”نہیں، بلکہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی نسل سے وہ لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہ لا شریک کی بندگی کریں گے۔“ (بخاری، بدء الخلق)

اس کے بعد آپ چند روز نخلہ کے مقام پر جا کر ٹھہر گئے۔ انہی ایام میں ایک روز رات کو آپ نماز میں قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا، انہوں نے قرآن سنا، ایمان لائے، واپس جا کر اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ خوش خبری سنائی کہ انسان چاہے آپ کی دعوت سے بھاگ رہے ہوں، مگر بہت سے جن اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور وہ اسے اپنی جنس میں پھیلا رہے ہیں۔

موضوع اور مباحث

سورۃ کا موضوع کفار کو ان گمراہیوں کے نتائج سے خبردار کرنا ہے جن میں وہ نہ صرف مبتلا تھے، بلکہ بڑے اصرار اور غرور و استکبار کے ساتھ ان پر جمے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا کی حیثیت محض ایک بے مقصد کھلونے کی تھی اور اس کے اندر اپنے آپ کو وہ غیر جواب دہ مخلوق سمجھ رہے تھے۔ توحید کی دعوت ان کے خیال میں باطل تھی اور قرآن کے متعلق یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ یہ خداوند عالم کا کلام ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کے برحق نہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ تھا کہ صرف چند نوجوان، چند غریب لوگ اور چند غلام ہی اس پر ایمان لائے ہیں۔ وہ قیامت، اور زندگی بعد موت، اور جزا و سزا کی باتوں کو ایک من گھڑت افسانہ سمجھتے تھے۔

اس سورۃ میں بالاختصار انہی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی مدلل تردید کی گئی ہے اور کفار کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم اگر قرآن کی دعوت کو رد کر دو گے تو آپ اپنا ہی انجام خراب کرو گے۔

آيَاتُهَا ۳۵ ﴿۳۶﴾ سُورَةُ الْأَحْقَافِ مَكِّيَّةٌ ﴿۶۶﴾ رُكُوعَاتُهَا ۲

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 حم ﴿۱﴾ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿۲﴾
 مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ
 مُّسَمًّى ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا أُنذِرُوا مُّعْرِضُونَ ﴿۳﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ
 مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ

۳۵
۳۶

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

ح، م۔ اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔^[۱] ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق، اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے۔^[۲] مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے ان کو خبر دار کیا گیا ہے۔^[۳] اے نبی، ان سے کہو، ”کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا بھی کہ وہ ہستیاں ہیں کیا جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟

[۱] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، سورۃ الزمر، حاشیہ ۱، اور سورۃ الجاثیہ، حاشیہ ۱، اس کے ساتھ سورۃ السجدہ، حاشیہ ۱ بھی نگاہ میں رہے تو اس تمہید کی روح سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

[۲] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو {الانعام، حاشیہ ۳۶۔ یونس، حاشیہ ۱۱۔ ابراہیم، حاشیہ ۲۶۔ الحجر، حاشیہ ۴۷۔ النحل، حاشیہ ۶۔ الانبیاء، حاشیہ ۱۵۔ المؤمنون، حاشیہ ۱۰۲، ۱۰۳۔ العنکبوت، حاشیہ ۷۵۔ الروم، حاشیہ ۶۔ لقمان، حاشیہ ۵۱۔ الذخاں، حاشیہ ۳۳۔ الجاثیہ، حاشیہ ۲۸۔

[۳] یعنی واقعی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ نظام کائنات ایک بامقصد حکیمانہ نظام ہے جس میں لازماً نیک و بد اور ظالم و مظلوم کا فیصلہ انصاف کے ساتھ ہونا ہے، اور کائنات کا موجودہ نظام دائمی وابدی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک خاص عمر مقرر ہے جس کے خاتمے پر اسے لازماً درہم برہم ہو جانا ہے، اور خدا کی عدالت کے لیے بھی ایک وقت طے شدہ ہے جس کے آنے پر وہ ضرور قائم ہونی ہے، لیکن جن لوگوں نے خدا کے رسول اور اس کی کتاب کو ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ان حقائق سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

آگے کی تقریر سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ انسان کی سب سے بڑی بنیادی غلطی وہ ہے جو وہ خدا کے متعلق اپنے عقیدے کے تعین میں کرتا ہے۔ اس معاملہ میں سہل انگاری سے کام لے کر کسی گہرے اور سنجیدہ فکر و تحقیق کے بغیر ایک سرسری یا سانسنا یا عقیدہ بنالینا ایسی عظیم حماقت ہے جو دنیا کی زندگی میں انسان کے پورے رویے کو، اور ابد الآباد تک کے لیے اس کے انجام کو خراب کر کے رکھ دیتی ہے۔ لیکن جس وجہ سے آدمی اس خطرناک سہل انگاری میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ لیتا ہے اور اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ یا تو مرنے کے بعد سرے سے کوئی زندگی نہیں ہے جس میں مجھے باز پرس سے سابقہ پیش آئے، یا اگر ایسی کوئی زندگی ہو اور وہاں باز پرس بھی ہو تو جن ہستیوں کا دامن میں نے تھام رکھا ہے وہ مجھے انجام بد سے بچالیں گی۔

أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَوَاتِ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَذَا أَوْ
 آثَرَةٍ مِّن عِلْمٍ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳﴾ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا
 مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ
 عَنِ دُعَائِهِمْ غَفْلُونَ ﴿۴﴾ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً

یا آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اس سے پہلے آئی ہوئی کوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ (ان عقائد کے ثبوت میں) تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو۔^[۳] آخرا اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے^[۴] بلکہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے ان کو پکار رہے ہیں، اور جب تمام انسان جمع کیے جائیں گے اُس وقت وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن اور

[۴] چونکہ مخاطب ایک مشرک قوم کے لوگ ہیں اس لیے ان کو بتایا جا رہا ہے کہ احساس ذمہ داری کے فقدان کی وجہ سے وہ کس طرح بے سوچے سمجھے ایک نہایت غیر معقول عقیدے سے چپے ہوئے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق کائنات ماننے کے ساتھ بہت سی دوسری ہستیوں کو معبود بنائے ہوئے تھے، انہی ہستیوں کے متعلق ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ انہیں آخرا کس بنیاد پر تم نے اپنا معبود مان رکھا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو معبودیت میں حصہ دار قرار دینے کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو آدمی کو خود کسی ذریعہ علم سے یہ معلوم ہو کہ زمین و آسمان کے بنانے میں واقعی اس کا بھی کوئی حصہ ہے۔ یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا ہو کہ فلاں صاحب بھی خدائی کے کام میں میرے شریک ہیں۔ اب اگر کوئی مشرک {ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا بھی دعویٰ نہ کر سکتا} ہو تو لامحالہ اس کا عقیدہ قطعی بے بنیاد ہی ہوگا۔

اس آیت میں ”پہلے آئی ہوئی کتاب“ سے مراد کوئی ایسی کتاب ہے جو قرآن سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی ہو۔ اور علم کے ”بقیہ“ سے مراد قدیم زمانے کے انبیاء اور صلحاء کی تعلیمات کا کوئی ایسا حصہ ہے جو بعد کی نسلوں کو کسی قابل اعتماد ذریعہ سے پہنچا ہو۔ ان دونوں ذرائع سے جو کچھ بھی انسان کو ملا ہے اُس میں کہیں شرک کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔

[۵] جواب دینے سے مراد {کسی کی درخواست پر فیصلہ صادر کرنا ہے}۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اگر ان معبودوں سے فریاد یا استغاثہ کرے، یا ان سے کوئی دعا مانگے، تو چونکہ ان کے ہاتھ میں کوئی طاقت اور کوئی اختیار نہیں ہے، اس لیے وہ اس کی درخواست پر کوئی کارروائی نفی یا اثبات کی شکل میں نہیں کر سکتے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، الزمر، حاشیہ ۳۳)

[۶] یعنی ان تک ان پکارنے والوں کی پکار سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ نہ وہ خود اپنے کانوں سے اُس کو سنتے ہیں، نہ کسی ذریعہ سے ان تک یہ اطلاع پہنچتی ہے کہ دنیا میں کوئی انہیں پکار رہا ہے۔ اس ارشاد الہی کو تفصیلاً یوں سمجھیے کہ دنیا بھر کے مشرکین خدا کے سوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں وہ تین اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک، بے روح اور بے عقل مخلوقات۔ دوسرے، وہ بزرگ انسان جو گزر چکے ہیں۔ تیسرے، وہ گمراہ انسان جو خود بگڑے ہوئے تھے اور دوسروں کو بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے عابدوں کی دعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر ہی ہے۔ رہے دوسری قسم کے معبود، تو ان کے بے خبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں جہاں انسانی آوازیں براہ راست اُن تک نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی ان تک یہ اطلاع

وَكَانُوا عِبَادَ تِهِمْ كَافِرِينَ ﴿۶﴾ وَإِذَا تَعَلَّى عَلَيْهِمُ الْيَتْنَا بَسْتِ
 قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَبَّا جَاءَهُمْ هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۷﴾
 أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ط قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَبْلُكُونَ

ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔ اے

ان لوگوں کو جب ہماری صاف، صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آجاتا ہے تو یہ کافر لوگ اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسول نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟^{۱۱} ان سے کہو، ”اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پجز سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے،

نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو آپ ساری عمر اللہ سے دعا، لکنا سلھاتے رہے تھے وہ اب الٰہی آپ سے دُعائیں مانگ رہے ہیں، اس لیے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو صدمہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہوسکتی، اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی ارواح کو اذیت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معادلہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے بے خبر بننے کے بھی دو ہی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملزموں کی حیثیت سے اللہ کے ہاں حوالات میں بند ہیں جہاں دنیا کی کوئی آواز انہیں نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی انہیں یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ تمہارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں معبود بنائے بیٹھے ہیں، اس لیے کہ یہ خبریں ان کے لیے سرت کی موجب ہوں گی، اور خدا ان ظالموں کو ہرگز خوش نہیں کرنا چاہتا۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا والوں کے سلام اور ان کی دعائے رحمت پہنچا دیتا ہے، کیونکہ یہ چیزیں ان کے لیے فرحت کی موجب ہیں، اور انی طرح وہ مجرموں کو دنیا والوں کی لعنت اور پھینکا راورز جرو توخ سے مطلع فرما دیتا ہے جیسے جنگ بدر میں مارے جانے والے کفار کو ایک حدیث کے مطابق نبی ﷺ کی توخ سنوادی گئی، کیونکہ یہ ان کے لیے اذیت کی موجب ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جو صالحین کے لیے رنج کی موجب، یا مجرمین کے لیے فرحت کی موجب ہو وہ ان تک نہیں پہنچائی جاتی۔ اس تشریح سے سارے موتی کے مسئلے کی حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

[۷] یعنی وہ صاف صاف کہہ دیں گے کہ نہ ہم نے ان سے کبھی یہ کہا تھا کہ تم مدد کے لیے ہمیں پکارا کرو، ہم تمہاری حاجت روائی کرنے والے ہیں، اور نہ ہمیں یہ خبر کہ یہ لوگ ہمیں پکارا کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں خود ہی حاجت روا فرض کر لیا اور خود ہی ہم کو پکارنا شروع کر دیا۔

[۸] اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن کی آیات کفار مکہ کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ صاف یہ محسوس کرتے تھے کہ اس کلام کی شان انسانی کلام سے بدرجہا بلند ہے۔ مگر وہ چونکہ اپنے ضمیر پر از رہنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لیے سیدھی طرح اس کلام کو کلام وحی مان لینے کے بجائے یہ بات بناتے تھے کہ یہ کوئی جادو کا کوشش ہے۔ (ایک اور پہلو جس کے لحاظ سے وہ قرآن کو جادو قرار دیتے تھے، اس کی تشریح ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمادو: انعام، حاشیہ ۵، سورہ ص، حاشیہ ۵)

[۹] مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اتنے بے حیا ہیں کہ محمد ﷺ پر قرآن خود گھڑ لانے کا الزام رکھتے ہیں؟ حالانکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ یہ ان کا تصنیف کردہ کلام نہیں ہو سکتا، اور ان کا اسے سحر کہنا خود اس امر کا صریح اعتراف ہے کہ یہ ایک غیر معمولی کلام ہے جس کا کسی انسان کی تصنیف ہونا ان کے اپنے نزدیک بھی ممکن نہیں ہے۔

لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۗ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۗ كَفَىٰ
 بِهِ شَهِيدًا ۗ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۸﴾
 قُلْ مَا كُنْتُ بِدُعَاءِ مِنَ الرَّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۗ
 إِنُ أُنبِئُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۹﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ

جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے، میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے، اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ ان سے کہو، ”میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔“ اے نبی، ان سے کہو ”کبھی تم نے سوچا بھی کہ

[۱۰] چونکہ ان کے الزام کا محض باطل اور سراسر بٹ دھرمی پر مبنی ہونا بالکل ظاہر تھا اس لیے اس کی تردید میں دلائل پیش کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ پس یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اگر واقعی میں نے خود ایک کلام تصنیف کر کے اللہ کی طرف منسوب کرنے کا جرم عظیم کیا ہے، جیسا کہ تم الزام رکھتے ہو، تو مجھے خدا کی پکڑ سے بچانے کے لیے تم نہ آؤ گے، لیکن اگر یہ خدا ہی کا کلام ہے اور تم جھوٹے الزامات رکھ رکھ کر اسے رد کر رہے ہو تو اللہ تم سے نمٹ لے گا۔ حقیقت اللہ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

[۱۱] اس مقام پر یہ فقرہ دو معنی دے رہا ہے۔ ایک یہ کہ فی الواقع یہ اللہ کا حکم اور اس کا درگزر ہی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ زمین میں سانس لے رہے ہیں جنہیں خدا کے کلام کو اقرار دینے میں کوئی باک نہیں، اور نہ کوئی بے رحم اور سخت گیر خدا اس کائنات کا مالک ہوتا تو ایسی جسامتیں کرنے والوں کو ایک سانس کے بعد دوسرا سانس لینا نصیب نہ ہوتا۔ دوسرا مطلب اس فقرے کا یہ ہے کہ ظالمو، اب بھی اس ہٹ دھرمی سے باز آ جاؤ تو خدا کی رحمت کا دروازہ تمہارے لیے کھلا ہوا ہے، اور جو کچھ تم نے اب تک یا بے دہم عاف ہو سکتا ہے۔

[۱۲] اس ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ جب نبی ﷺ نے اپنے آپ کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو مکے کے لوگ اس پر طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ یا رسول ہے جو بال بچے رکھتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ {ان باتوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ الضحٰق، آیت ۷، ۸} پھر وہ لوگ آپ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں آپ سے پوچھتے تھے۔ ان خیال میں کسی شخص کا رسول خدا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ فوق البشری طاقتوں کا مالک ہو، اور پردہ غیب میں چھپی ہوئی ہر چیز اس پر روشن ہو۔

یہی باتیں ہیں جن کا جواب ان فقروں میں دیا گیا ہے۔

فرمایا، ان سے کہو، ”میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں۔“ یعنی میرا رسول بنایا جانا دنیا کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہے کہ تمہیں یہ سمجھنے میں پریشانی لاحق ہو کہ رسول کیسا ہوتا ہے اور کیسا نہیں ہوتا۔ مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں، اور میں ان سے مختلف نہیں ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کہ ان کے جواب میں یہ بھی کہو ”میں نہیں جانتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ کیا، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے بھیجی جاتی ہے۔“ یعنی میں عالم الغیب نہیں ہوں۔ تمہارا مستقبل تو درکنار، مجھے تو اپنا مستقبل بھی معلوم نہیں ہے۔ جس چیز کا وحی کے ذریعے سے مجھے علم دے دیا جاتا ہے اس کو میں جانتا ہوں۔

إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَأَمَّا إِنَّا لَأَيُّهَا الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿١٥﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَذَا أَفْكٌ قَدِيمٌ ﴿١٦﴾

اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہوگا)؟ اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ع

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جاسکتے تھے۔^[۱۵] چونکہ انہوں نے اُس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔^[۱۶]

آخر میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو ”میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔“ یعنی میں خدائی اختیارات کا مالک نہیں ہوں کہ وہ عجیب و غریب معجزے تمہیں دکھاؤں جن کے مطالبے تم مجھ سے آئے دن کرتے رہتے ہو۔ مجھے جس کام کے لیے بھیجا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے راہِ راست پیش کروں اور جو لوگ اسے قبول نہ کریں انہیں بُرے انجام سے خبردار کر دوں۔
[۱۳] یہ وہی مضمون ہے جو اس سے پہلے ایک دوسرے طریقہ سے سورہ حم السجدہ، آیت ۵۲ میں گزر چکا ہے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، سورہ مذکور، حاشیہ ۶۹۔

[۱۴] {اس بارے میں مفسرین کی رائیں مختلف ہیں کہ اس گواہ سے مراد کون ہیں، لیکن زیادہ صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جو مفسر نیشاپوری اور ابن کثیر نے بیان کی ہے کہ یہاں گواہ سے مراد کوئی خاص شخص نہیں، بلکہ بنی اسرائیل کا ایک عام آدمی ہے۔ ارشاد اللہ کا مدعا یہ ہے کہ قرآن مجید جو تعلیم تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے یہ کوئی انوکھی چیز بھی نہیں ہے جو دنیا میں پہلی مرتبہ تمہارے ہی سامنے پیش کی گئی ہو اور تم یہ عذر کر سکو کہ ہم یہ زالی باتیں کیسے مان لیں جو نوع انسانی کے سامنے کبھی آئی ہی نہ تھیں۔ اس سے پہلے یہی تعلیمات اسی طرح وحی کے ذریعے سے بنی اسرائیل کے سامنے توراہ اور دوسری کتب آسمانی کی شکل میں آچکی ہیں، اور ان کا ایک عام آدمی ان کو مان چکا ہے، اور یہ بھی تسلیم کر چکا ہے کہ اللہ کی وحی ان تعلیمات کے نزول کا ذریعہ ہے۔ اس لیے تم لوگ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وحی اور یہ تعلیمات ناقابل فہم چیزیں ہیں۔ اصل بات صرف یہ ہے کہ تمہارا غرور، تکبر اور بے بنیاد گھمنڈ ایمان لانے میں مانع ہے۔

[۱۵] ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ قرآن برحق ہوتا اور محمد (ﷺ) ایک صحیح بات کی طرف دعوت دے رہے ہوتے تو قوم کے سردار اور شیوخ اور معززین آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چند نا تجربہ کار لڑکے اور چند ادنیٰ درجہ کے غلام تو ایک معقول بات کو مان لیں اور قوم کے بڑے بڑے لوگ، جو دانا اور جہاں دیدہ ہیں، اور جن کی عقل و تدبیر پر آج تک قوم اعتماد کرتی رہی ہے، اس کو رد کر دیں۔

[۱۶] یعنی ان لوگوں نے اپنے آپ کو حق و باطل کا معیار قرار دے رکھا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جس ہدایت کو یہ قبول نہ کریں وہ ضرور ضلالت ہی ہونی چاہیے۔ لیکن یہ اسے ”نیا جھوٹ“ کہنے کی ہمت نہیں رکھتے، کیونکہ اس سے پہلے بھی انبیاء علیہم السلام یہی تعلیمات پیش

وَمِنْ قَبْلِهِ كَتَبَ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۗ وَهَذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ
لِّسَانِ عَرَبِيًّا لِّيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۗ وَبُشْرَىٰ لِلْبِحْسِينِ ۗ إِنَّ
الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ۗ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا
وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۗ وَحَمَلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۗ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ

حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آچکی ہے، اور یہ کتاب اُس کی تصدیق کرنے والی زبانِ عربی میں آئی ہے تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے^[۱۷] اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے۔ یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اُس پر جم گئے، اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔^[۱۸] ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اپنے اُن اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں۔

ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اُس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا، اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔^[۱۹] یہاں تک کہ

کرتے رہے ہیں، اس لیے یہ اسے ”پرانا جھوٹ“ کہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ سب لوگ بھی دانائی سے محروم تھے جو ہزاروں برس سے ان حقائق کو پیش کرتے اور مانتے چلے آ رہے ہیں، اور تمام دانائی صرف ان کے حصے میں آ گئی ہے۔
[۱۷] یعنی اُن لوگوں کو انجامِ بد سے خبردار کر دے جو اللہ سے کفر اور غیر اللہ کی بندگی کر کے اپنے اوپر اور حق و صداقت پر ظلم کر رہے ہیں۔

[۱۸] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، حم السجدہ، حاشیہ ۳۳-۳۵۔

[۱۹] یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اگرچہ اولاد کو ماں اور باپ دونوں ہی کی خدمت کرنی چاہیے، لیکن ماں کا حق اپنی اہمیت میں اس بنا پر زیادہ ہے کہ وہ اولاد کے لیے زیادہ تکلیفیں اٹھاتی ہے۔ یہی بات اُس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، اور امام بخاری کی ادب المفرد میں وارد ہوئی ہے کہ ایک صاحب نے حضور سے پوچھا کس کا حق خدمت مجھ پر زیادہ ہے؟ فرمایا تیری ماں کا۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون؟ فرمایا تیری ماں۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون؟ فرمایا تیری ماں۔ انہوں نے پوچھا اس کے بعد کون؟ فرمایا تیرا باپ۔ حضور کا یہ ارشاد ٹھیک ٹھیک اس آیت کی ترجمانی ہے، کیونکہ اس میں بھی ماں کے تہرے حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: (۱) اس کی ماں نے اسے مشقت اٹھا کر پیٹ میں رکھا (۲) مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا (۳) اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں ۳۰ مہینے لگ گئے۔

أَشَدُّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً لَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ
الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ
وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۗ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۵﴾

جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اُس نے کہا ”اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیری اُن نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں، اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو، اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے، میں تیرے حضور تو بہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔“

اس آیت، اور سورہ لقمان کی آیت ۱۴، اور سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۳۔ ان تینوں آیات کو ملا کر پڑھنے سے حسب ذیل قانونی احکام نکلتے ہیں:

(۱) جو عورت نکاح کے بعد چھ مہینے سے کم مدت میں صحیح و سالم بچہ جنے (یعنی وہ اسقاط نہ ہو بلکہ وضع حمل ہو) وہ زانیہ قرار پائے گی اور اس کے بچے کا نسب اس کے شوہر سے ثابت نہ ہوگا۔

(۲) جو عورت نکاح کے چھ مہینے بعد یا اس سے زیادہ مدت میں زندہ سلامت بچہ جنے اس پر زنا کا الزام محض اس ولادت کی بنیاد پر نہیں لگایا جاسکتا، بچہ لازماً اس کے شوہر ہی کا مانا جائے گا۔

(۳) رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ اس عمر کے بعد اگر کسی بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہو تو وہ اس کی رضاعی ماں قرار نہیں پائے گی اور نہ وہ احکام رضاعت اس پر مرتب ہوں گے جو سورہ نساء، آیت ۲۳ میں بیان ہوئے ہیں۔ اس معاملے میں امام ابوحنیفہ نے برسبیل احتیاط دو سال کے بجائے ڈھائی سال کی مدت تجویز کی ہے تاکہ حرمت رضاعت جیسے نازک مسئلے میں خطا کر جانے کا احتمال باقی نہ رہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، سورہ لقمان، حاشیہ ۲۳)

اس مقام پر یہ جان لینا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ جدید ترین طبی تحقیقات کی رو سے ماں کے پیٹ میں ایک بچے کو کم از کم ۲۸ ہفتے درکار ہوتے ہیں جن میں وہ نشوونما پانچ ماہ تک زندہ ولادت کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ مدت ساڑھے چھ مہینے سے کچھ زیادہ بنتی ہے۔ اسلامی قانون میں نصف مہینے کے قریب مزید رعایت دی گئی ہے، کیونکہ ایک عورت کا زانیہ قرار پانا اور ایک بچے کا نسب سے محروم ہو جانا بڑا سخت معاملہ ہے، اور اس کی نزاکت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ماں اور بچے، دونوں کو اس کے قانونی نتائج سے بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش دی جائے۔ علاوہ بریں کسی طبیب، کسی قاضی حتیٰ کہ خود حاملہ عورت اور اسے بارور کرنے والے مرد کو بھی ٹھیک ٹھیک یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ استحقاقِ حمل کس وقت ہوا ہے۔ یہ بات بھی اس امر کی متقاضی ہے کہ حمل کی کم سے کم قانونی مدت کے تعیین میں چند روز کی مزید گنجائش رکھی جائے۔

[۲۰] یعنی مجھے ایسے نیک عمل کی توفیق دے جو اپنی ظاہری صورت میں ٹھیک ٹھیک تیرے قانون کے مطابق ہو، اور حقیقت میں بھی تیرے ہاں مقبول ہونے کے لائق ہو۔ ایک عمل اگر دنیا والوں کے نزدیک بڑا اچھا ہو، مگر خدا کے قانون کی پیروی اس میں نہ کی گئی ہو، تو دنیا کے لوگ چاہے اس پر کتنی ہی داد دیں، خدا کے ہاں وہ کسی داد کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف ایک عمل ٹھیک ٹھیک شریعت کے مطابق ہوتا ہے اور بظاہر اس کی شکل میں کوئی کسر نہیں ہوتی، مگر نیت کی خرابی، ریاء، خود پسندی، فخر و غرور، اور دنیا طلبی اس کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے اور وہ بھی اس قابل نہیں رہتا کہ اللہ کے ہاں مقبول ہو۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَبِلُوا وَتَتَجَاوَزُ عَنْ
 سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعَدَّ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۱۶﴾
 وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أَفِ لَكُمْ أَنْ تُعِدَّنِي أَنْ أَخْرَجَ وَقَدْ خَلَّتِ
 الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِي وَهُمَا يَسْتَعْجِلَانِ اللَّهَ وَبِئْسَ لِلَّهِ بَلَاءٌ إِنَّ
 وَعَدَّ اللَّهُ حَقًّا فَيَقُولُ مَا هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۷﴾
 أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
 قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَسِرِينَ ﴿۱۸﴾ وَلِكُلِّ

اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں۔^[۲۱] یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے اُس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے۔ اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا: ”اف، تنگ کر دیا تم نے، کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد قبر سے نکالا جاؤں گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں (ان میں سے تو کوئی اٹھ کر نہ آیا)۔“ ماں اور باپ اللہ کی دوہائی دے کر کہتے ہیں ”ارے بد نصیب، مان جا، اللہ کا وعدہ سچا ہے۔“ مگر وہ کہتا ہے ”یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔“ یہ وہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جوٹولے (اسی قماش کے) ہو گزرے ہیں انہی میں یہ بھی جا شامل ہوں گے۔ بے شک یہ گھائے میں رہ جانے والے لوگ ہیں۔^[۲۲]

[۲۱] یعنی دنیا میں انہوں نے جو بہتر سے بہتر عمل کیا ہے، آخرت میں ان کا درجہ اسی کے لحاظ سے مقرر کیا جائے گا اور ان کی لغزشوں، کمزوریوں اور خطاؤں پر گرفت نہیں کی جائے گی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک کریم النفس اور قدر شناس آقا اپنے خدمت گزار اور وفادار ملازم کی قدر اس کی چھوٹی چھوٹی خدمات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کی کسی ایسی خدمت کے لحاظ سے کرتا ہے جس میں اس نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو، یا جاں نثاری و وفا شعاری کا کمال کر دکھایا ہو۔ اور ایسے خادم کے ساتھ وہ یہ معاملہ نہیں کیا کرتا کہ اس کی ذرا ذرا سی کوتاہیوں پر گرفت کر کے اس کی ساری خدمات پر پانی پھیر دے۔

[۲۲] یہاں دو طرح کے کردار آئے ہیں۔ پہلے ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنی کوتاہیوں سے کون سا کردار بہتر ہے۔ اُس وقت یہ دونوں ہی کردار معاشرے میں عملاً موجود تھے اور لوگوں کے لیے یہ جاننا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ پہلی قسم کا کردار کہاں پایا جاتا ہے اور دوسری قسم کا کہاں۔ یہ جواب ہے سردارانِ قریش کے اس قول کا کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ چند لوگوں اور چند غلام اس معاملہ میں ہم سے بازی نہ لے جاسکتے تھے۔ اس جواب کے آئینے میں ہر شخص خود دیکھ سکتا تھا کہ ماننے والوں کا کردار کیا ہے اور نہ ماننے والوں کا کیا۔

دَرَجَاتٍ مِّمَّا عِبِلُوا ۖ وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٣﴾
 وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلْهَبْتُمْ طِبِّتِكُمْ فِي
 حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۖ وَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ
 بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ
 تَفْسُقُونَ ﴿٢٤﴾ وَادْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ ﴿٢٥﴾

دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔^[۲۳] پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لاکھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: ”تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھالیا، اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔“^[۲۴] ذرا انھیں عاد کے بھائی (ہوڈ) کا قصہ سناؤ جب کہ اُس نے احقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا۔^[۲۵]

[۲۳] یعنی نہ اچھے لوگوں کی نیکیاں اور قربانیاں ضائع ہوں گی، نہ برے لوگوں کو ان کی واقعی برائی سے بڑھ کر سزا دی جائے گی۔ نیک آدمی اگر اپنے اجر سے محروم رہ جائے یا اپنے حقیقی استحقاق سے کم اجر پائے تو یہ بھی ظلم ہے، اور برا آدمی اپنے کیے کی سزا نہ پائے، یا جتنا کچھ قصور اس نے کیا ہے اس سے زیادہ سزا پائے تو یہ بھی ظلم ہے۔

[۲۴] ذلت کا عذاب اُس تکبر کی مناسبت سے ہے جو انہوں نے کیا۔ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ رسول پر ایمان لا کر غریب اور فقیر مومنوں کے گروہ میں شامل ہو جانا ان کی شان سے گری ہوئی بات ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے غرور کو خاک میں ملا کر رکھ دے گا۔

[۲۵] چونکہ سرداران قریش اپنی بڑائی کا زعم رکھتے تھے اور اپنی ثروت و مشیخت پر پھولے نہ مہاتے تھے، اس لیے یہاں ان کو قوم عاد کا قصہ سنایا جا رہا ہے جس کے متعلق عرب میں مشہور تھا کہ قدیم زمانے میں وہ اس سرزمین کی سب سے زیادہ طاقت ور قوم تھی۔ احقاف ہقف کی جمع ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ریت کے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ پہنچے ہوں۔ لیکن اصطلاحاً یہ صحرائے عرب (الریح الخالی) کے جنوبی مغربی حصے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عاد کا علاقہ عمان سے یمن تک پھیلا ہوا تھا، اور قرآن مجید میں بتاتا ہے کہ ان کا اصل وطن الاحقاف تھا جہاں سے نکل کر وہ گرد و پیش کے ممالک میں پھیلے اور کنز و قوموں پر چھا گئے۔ آج کے زمانے تک بھی جنوبی عرب کے باشندوں میں یہی بات مشہور ہے کہ عاد اسی علاقے میں آباد تھے۔ موجودہ شہر مُنگلا سے تقریباً ۱۲۵ میل کے فاصلے پر شمال کی جانب حضرموت میں ایک مقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہوڈ کا مزار بنا رکھا ہے اور وہ قبر ہوڈ کے نام ہی سے مشہور ہے۔

الاحقاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شان دار تمدن رکھنے والی طاقت ور قوم آباد ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہوگا اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگ زار بنا دیا ہوگا۔ آج

وَقَدْ خَلَّتِ النَّذْرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا
 اللَّهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۲۱﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا
 لِنَأْفِكَنَا عَنِ الْهَيْئَةِ فَاْتِنَابِنَا تَعِدَانَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۲۲﴾
 قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِبْلَغُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ
 وَلَكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿۲۳﴾ فَلَمَّا سَرَ أَوَّلَ عَارِضًا
 مُسْتَقْبِلَ أَوْدِيَّتِهِمْ لَا قَالُوا هَذَا عَارِضٌ مُهْطِرُنَا بَلْ هُوَ

اور ایسے خبردار کرنے والے اُس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے۔ کہ ”اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔“ انہوں نے کہا ”کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر واقعی تو سچا ہے۔“ اُس نے کہا ”اس کا علم تو اللہ کو ہے،^[۲۱] میں صرف وہ پیغام تمہیں پہنچا رہا ہوں جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔“^[۲۲] پھر جب انہوں نے اُس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے ”یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا۔“ ”نہیں،^[۲۳] بلکہ یہ وہی چیز ہے

اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک لق ووق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۸۴۳ء میں یوریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت موت کی شمالی سطح مرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قلعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بڈ اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے۔ میں نے دور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ ۲۵ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا، اور اُس رسی کا سراگل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔

[۲۶] یعنی یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ تم پر عذاب کب آئے گا۔ اس کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے کہ تم پر کب عذاب نازل کیا جائے اور کب تک تمہیں مہلت دی جائے۔

[۲۷] یعنی تم اپنی نادانی سے میری اس تشبیہ کو مذاق سمجھ رہے ہو اور کھیل کے طور پر عذاب کا مطالبہ کیے جاتے ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ خدا کا عذاب کیا چیز ہوتا ہے اور تمہاری حرکات کی وجہ سے وہ کس قدر تمہارے قریب آچکا ہے۔

[۲۸] یہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ اُن کو یہ جواب کس نے دیا۔ کلام کے انداز سے خود بخود یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ وہ جواب تھا جو اصل صورت حال نے عملًا ان کو دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ بادل ہے جو ان کی وادیوں کو سیراب کرنے آیا ہے، اور حقیقت میں تھا وہ ہوا کا طوفان جو انہیں تباہ و برباد کرنے کے لیے بڑھا چلا آ رہا تھا۔

مَا اسْتَعَجَلْتُمْ بِهِ طُرُوحًا فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۳۳﴾ تَدْمِرُ كُلَّ شَيْءٍ عِوَاءً مَّرِيرًا رِيحًا صَبِيحًا لَا يَرَى إِلَّا مَسْكِنَهُمْ كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِي مَآئِنَ الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً ۖ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ ﴿۳۵﴾ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقُرَىٰ وَصَرَفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۳۷﴾ فَلَوْلَا نَصْرُهُمُ الَّذِينَ

جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے، اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا۔“ آخر کار اُن کا حال یہ ہوا کہ اُن کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔^[۲۹] اُن کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے۔^[۳۰] اُن کو ہم نے کان، آنکھیں اور دل، سب کچھ دے رکھے تھے، مگر نہ وہ کان اُن کے کسی کام آئے، نہ آنکھیں، نہ دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے،^[۳۱] اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے یا

تمہارے گرد و پیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات بھیج کر بار بار طرح طرح سے اُن کو سمجھایا، شاید کہ وہ باز آجائیں۔ پھر کیوں نہ اُن ہستیوں نے اُن کی مدد کی

[۲۹] قوم عاد کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، {الاعراف، حواشی ۵۱-۵۶۔ ہود، حواشی ۵۳-۶۵۔ المؤمنون، حواشی ۳۳-۳۷۔ الشعراء، حواشی ۸۸-۹۳۔ العنکبوت، حواشی ۶۵-۶۶}۔ حم السجدة، حواشی ۲۰، ۲۱۔

[۳۰] یعنی مال، دولت، طاقت، اقتدار، کسی چیز میں بھی تمہارا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ تمہارا دائرہ اقتدار تو شہر مکہ کے حدود سے باہر کہیں بھی نہیں، اور وہ زمین کے ایک بڑے حصے پر چھائے ہوئے تھے۔

[۳۱] اس مختصر فقرے میں ایک اہم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ خدا کی آیات ہی وہ چیز ہیں جو انسان کو حقیقت کا صحیح فہم و ادراک بخشتی ہیں۔ یہ فہم و ادراک انسان کو حاصل ہوتا ہے آنکھوں سے ٹھیک دیکھتا ہے، کانوں سے ٹھیک سنتا ہے، اور دل و دماغ سے ٹھیک سوچتا اور صحیح فیصلے کرتا ہے۔ لیکن جب وہ آیات الہی کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اُسے نگاہ حق شناس نصیب نہیں ہوتی، کان رکھتے ہوئے بھی وہ ہر کلمہ نصیحت کے لیے بہرہ ہوتا ہے اور دل و دماغ کی جو نعمتیں خدا نے اسے دی ہیں ان سے الٹی سوچتا اور ایک سے ایک غلط نتیجہ اخذ کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی ساری قومیں خود اس کی اپنی ہی تباہی میں صرف ہونے لگتی ہیں۔

اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ
 وَذَلِكَ أَفْكَهُمُ وَمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۲۸﴾ وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ
 نَفْرًا مِنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا
 أَنْصَبُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ ﴿۲۹﴾
 قَالُوا يَا قَوْمِمْ إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا

جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا؟^[۳۲] بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے، اور یہ تھا ان کے جھوٹ اور ان بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے۔

(اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔^[۳۳] جب وہ اُس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انہوں نے جا کر کہا، ’اے ہماری قوم کے لوگو، ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے

[۳۲] یعنی ان ہستیوں کے ساتھ عقیدت کی ابتدا تو انہوں نے اس خیال سے کی تھی کہ یہ خدا کے مقبول بندے ہیں، ان کے وسیلے سے خدا کے ہاں ہماری رسائی ہوگی۔ مگر بڑھتے بڑھتے انہوں نے خود انہی ہستیوں کو معبود بنا لیا، انہی کو مدد کے لیے پکارنے لگے، انہی سے دعائیں مانگنے لگے، اور انہی کے متعلق یہ سمجھ لیا کہ یہ صاحب تصرف ہیں، ہماری فریاد رسی و مشکل کشائی یہی کریں گے۔ اس گمراہی سے ان کو نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات اپنے رسولوں کے ذریعے سے بھیج کر طرح طرح سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ اپنے ان جھوٹے خداؤں کی بندگی پر اڑے رہے اور اصرار کیے چلے گئے کہ ہم اللہ کے بجائے انہی کا دامن تھامے رہیں گے۔ اب بتاؤ، ان مشرک قوموں پر جب ان کی گمراہی کی وجہ سے اللہ کا عذاب آیا تو ان کے وہ فریاد رس اور مشکل کشا معبود کہاں مر رہے تھے؟ کیوں نہ اس بُرے وقت میں وہ ان کی دست گیری کو آئے؟

[۳۳] اس آیت کی تفسیر میں جو روایات حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ سے منقول ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ جنوں کی پہلی حاضری کا یہ واقعہ، جس کا اس آیت میں ذکر ہے، بطین نخلہ میں پیش آیا تھا۔ اور ابن اسحاق، ابونعیم اصفہانی وغیرہ کا بیان ہے کہ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب نبی ﷺ طائف سے مایوس ہو کر مکہ معظمہ کی طرف واپس ہوئے تھے۔ راستہ میں آپ نے نخلہ میں قیام کیا۔ وہاں عشا یا فجر یا تہجد کی نماز میں آپ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا، اور وہ آپ کی قراءت سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس کے ساتھ تمام روایات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اس موقع پر جن حضور کے سامنے نہیں آئے تھے، نہ آپ نے ان کی آمد کو محسوس فرمایا تھا بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے آپ کو ان کے آنے اور قرآن سننے کی خبر دی۔

لِبَايِنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَى طَرِيقٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۰﴾
 يُقَوْمُنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَامْنُوا بِهِ يُعْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ
 وَيُجْزِكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ﴿۳۱﴾ وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ

اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہِ راست کی طرف۔^[۳۰] اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اُس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذابِ الیم سے بچا دے گا۔^[۳۱] اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے

[۳۰] اس سے معلوم ہوا کہ یہ جن پہلے سے حضرت موسیٰ اور کتبِ آسمانی پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ قرآن سننے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء دیتے چلے آ رہے ہیں، اس لیے وہ اس کتاب، اور اس کے لانے والے رسول اللہ ﷺ پر بھی ایمان لے آئے۔

[۳۱] معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جنوں کے پے در پے وفد نبی ﷺ کے پاس حاضر ہونے لگے اور آپ سے ان کی رُودِ رُوملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس بارے میں جو روایات کتبِ حدیث میں منقول ہوئی ہیں، ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں کم از کم چھ وفد آئے تھے۔

ان میں سے ایک وفد کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ مکہ میں رات بھر غائب رہے۔ ہم لوگ سخت پریشان تھے کہ کہیں آپ پر کوئی حملہ نہ کر دیا گیا ہو۔ صبح سویرے ہم نے آپ کو حرا کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے پر آپ نے بتایا کہ ایک جن مجھے بلانے آیا تھا، میں نے اس کے ساتھ آ کر یہاں جنوں کے ایک گروہ کو قرآن سنایا۔ (مسلم، مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن مسعود ہی کی ایک اور روایت ہے کہ ایک مرتبہ مکہ میں حضور نے صحابہ سے فرمایا کہ آج رات تم میں سے کون میرے ساتھ جنوں کی ملاقات کے لیے چلتا ہے؟ میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مکہ کے بالائی حصہ میں ایک جگہ حضور نے لکیر کھینچ کر مجھ سے فرمایا کہ اس سے آگے نہ بڑھنا۔ پھر آپ آگے تشریف لے گئے اور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے اشخاص ہیں جنہوں نے آپ کو گھیر رکھا ہے اور وہ میرے اور آپ کے درمیان حائل ہیں۔ (ابن جریر، بیہقی، دلائل النبوة۔ ابونعیم اصفہانی، دلائل النبوة)

ایک اور موقع پر بھی رات کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعود نبی ﷺ کے ساتھ تھے اور مکہ معظمہ میں حجون کے مقام پر جنوں کے ایک مقدمہ کا آپ نے فیصلہ فرمایا۔ اس کے سالہا سال بعد ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں جاٹوں کے ایک گروہ کو دیکھ کر کہا حجون کے مقام پر جنوں کے جس گروہ کو میں نے دیکھا تھا وہ ان لوگوں سے بہت مشابہ تھا۔ (ابن جریر)

[۳۲] ہو سکتا ہے کہ یہ فقرہ بھی جنوں ہی کے قول کا حصہ ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے قول پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اضافہ ہو۔ فحوائے کلام سے دوسری بات زیادہ قرین قیاس محسوس ہوتی ہے۔

بِعَجْزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءُ أُولَئِكَ فِي صَلِّ
 مُبِينٍ ﴿۳۲﴾ أَوْلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ
 وَلَمْ يَعْصِ بِخَلْقِهِنَّ بِقَدِيرٍ عَلَىٰ أَنْ يَعْصِيَ الْهَوَىٰ ط بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ
 كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۳﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ ط
 أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ط قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ
 بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۳۴﴾ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ
 وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ ط كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرُونَ مَا يوعَدُونَ لَا كُم يَلْبَثُونَ
 إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ط بَلَّغْ فَهَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الْفَاسِقُونَ ﴿۳۵﴾

وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتہ رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے، اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچالیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور کیا ان لوگوں کو یہ بھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے اور ان کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا، وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے؟ کیوں نہیں، یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے، اُس وقت ان سے پوچھا جائے گا ”کیا یہ حق نہیں ہے؟“ یہ کہیں گے ”ہاں، ہمارے رب کی قسم (یہ واقعی حق ہے)۔“ اللہ فرمائے گا ”اچھا تو اب عذاب کا مزہ چکھو اپنے اُس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے۔“

پس اے نبی، صبر کرو جس طرح اولو العزم رسولوں نے صبر کیا ہے، اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ [۳۴] جس روز یہ لوگ اُس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انہیں یوں معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی، اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا؟

[۳۴] یعنی جس طرح تمہارے پیش رو انبیاء اپنی قوم کی بے زنی، مخالفت، مزاحمت اور طرح طرح کی ایذا رسانیوں کا مقابلہ سا لہا سال تک مسلسل صبر اور ان تھک جدوجہد کے ساتھ کرتے رہے اسی طرح تم بھی کرو، اور یہ خیال دل میں نہ لاؤ کہ یا تو یہ لوگ جلدی سے ایمان لے آئیں یا پھر اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کر دے۔